Rizwan Ullah
D-178, Abul Fazl Enclave-I
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel: +91-9971283786, 9891832189
Email:ruilmi@rediffmail.com
Web: www.Rizwanullah.com

آسمانِ فاروقی کی کہکشاں

رضوان اللہ

جس آسمانِ فاروقی کا تذکرہ کررہا ہوں، اسی آسمان کے ٹوٹے ہوئے ایک روشن ستارے محبوب الرحمٰن فاروقی کی ایک یادگاری تقریب اس تحریر کی محرک ہوئی۔ اسی آسمان کے ماہ تمام کو جو دنیائے ادب کا بے تاج بادشاہ ہے دنیا شمس الرحمٰن فاروقی کے نام سے جانتی ہے۔ یہ آسمان موضع کوئریا پار پر محیط ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان چاند تاروں نے کبھی اس گاؤں سے اپنی نسبت کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے اس آبائی وطن کے علاوہ اپنے ثانوی یا اختیار کردہ وطن سے بھی کسی نسبت کا اظہار نہیں کیا، بس وہ جہاں بھی رہے ان کی ضوفشانیاں تا حدامکان جاری رہیں۔ شاید ان کے لاشعور میں آفاقیت کا کوئی احساس جاں گزیر رہا ہے جو منصۂ شہود پر نہ خود آیا نہ کسی محدودیت کو ابھرنے دیا۔ اسی آفاق سے تعلق رکھنے والے علماء میں بھی یہی کیفیت مضمر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی تصنیف تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ میں جن علماء کا ذکر کیا ہے ان میں سے کئی کا تعلق کوئریا پار سے ہے جنھوں نے خود نہ اعظم گڑھ سے نہ کوئریا پار سے کوئی نسبت ظاہر کی۔ ان میں مولوی محمد اصغر صاحب کا اسم گرامی بھی شامل ہے جو مذکورہ بالا دونوں فاروقیان کے دادا تھے۔ ان کا تذکرہ قمر الزماں مبارکپوری کی تصنیف سخنورانِ اعظم گڑھ میں بھی شامل ہے لیکن وہی مقامی نسبت کے بغیر۔

چونکہ مولوی محمد اصغر صاحب میرے بڑے ابا تھے یعنی میرے والد مولوی سبحان اللہ صاحب کے چچا زاد بھائی تھے اور ان کی ذات بابرکات سے شروع ہونے والا پورا سلسلہ میری نظروں کے سامنے ہے اس لیے بات وہیں سے شروع کرنا چاہتا ہوں گو یہ سب ماضی کے جھروکوں سے نظر آنے والا ایک خوشگوار منظر ہے جو اس خوشگوار خواب کی طرح ہے جسے دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل جانے کے بعد اسے دیکھتے رہنے کے لیے آنکھیں موندتے رہتے ہیں لیکن وہ کہاں نظر آتا ہے اسی ماضی کی طرح جسے ہم کبھی کبھی اپنی کھلی آنکھوں سے خواب کی طرح دیکھتے رہتے ہیں۔

یہ تو نہیں معلوم کہ کوئریا پار کی سرزمین پر فاروقی بزرگوں کا ورود مسعود کب ہوا لیکن قیاس یہی ہے کہ علمائے جونپور جب تبلیغ دین کے لیے نکلے اور ہر طرف کارواں در کارواں روانہ ہوئے اسی زمانے میں ان بزرگوں میں سے

کوئی اسی دیار میں بھی وارد ہوئے ہوں گے۔ اس وقت ضلع اعظم گڑھ کا علاقہ بھی جونپور میں شامل تھا، اس لیے علمائے اعظم گرھ بھی علمائے جونپور میں شمار کیے جاتے تھے اور کوئریا پار اس وقت ضلع اعظم گڑھ کا حصہ تھا، اس لیے کوئریا پار میں مقیم علماء کا شمار بھی علمائے اعظم گڑھ میں کیا گیا۔

موضع کوئریا پار کی شمال مشرقی حدوں کے قریب ایک تالاب ہے اس کے پوربی کنارے پر زمانۂ قدیم کا ایک مزار ہے جو لکھوری اینٹوں کا ہے، ایک زمانے سے سرد وگرم حالات کی دست برد کے باوجود اس کا بڑا حصہ باقی ہے۔ برادر محترم خلیل الرحمٰن فاروقی صاحب مرحوم نے (جو شمس الرحمٰن فاروقی کے والد تھے) اپنی تصنیف قصص الجمیل فی سوانح خلیل میں لکھا ہے کہ وہ مزار ایک بزرگ کوڑیا شاہ کا ہے انہی کی نسبت سے اس موضع کا نام کوڑیا پار ہوا، اسی کی بگڑی ہوئی یا بدلی ہوئی شکل کوئریا پار ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس علاقے میں وارد ہونے والے اولین بزرگوں میں وہ شامل رہے ہوں۔ قمر الزماں مبارکپوری اپنی تصنیف سخنورانِ اعظم گڑھ میں لکھتے ہیں کہ ضلع اعظم گڑھ میں سات پرگنے تھے جن میں سے ایک کا نام کوڑیا تھا غالباً اسی پرگنہ کے علاقے میں قیام پذیر ہونے والے بزرگ کو کوڑیا شاہ کہا گیا ہوگا۔

بہرحال ہم اپنی موجودہ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کر سکتے ہیں جہاں ہمارے بڑے ابا مولوی محمد اصغر فاروقی صاحب اور ہمارے والد مولوی محمد سبحان اللہ فاروقی صاحب کے مشترک مورث اعلیٰ ہیں یعنی شیخ علی بخش فاروقی۔ ان کے دو صاحبزادگان محمد اکرام فاروقی اور خادم الحق فاروقی تھے۔ اول الذکر کے صاحبزادے محمد اصغر فاروقی اور موخر الذکر کے محمد سبحان اللہ فاروقی جو ہمارے والد تھے۔ ان کا قصہ مختصر ہے اس لیے اس کو یہیں بیان کر دیں۔ ان کے دو بڑے اور ایک چھوٹے بھائی نوجوانی میں ہی داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ بیوہ ماں کا تین نوجوان بیٹوں کو کھو دینے کے بعد کیا حال ہوا ہوگا، اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ ایک بیٹے کی نہ معلوم کیسے پرورش ہوئی۔ ان کے تین بھائی جو مئو میں بہت بزرگ اور مشہور اطباء میں سے تھے انھوں نے ہی اس یتیم کی سرپرستی کی۔

مولوی محمد اصغر صاحب کو اللہ نے آٹھ فرزند عطا کیے۔ ان میں سے ایک مسعود الرحمٰن کا طفلی میں ہی انتقال ہو گیا لیکن بقیہ سات کو اللہ نے ایسی ایسی خوبیوں کا مرقع بنایا کہ انھیں بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں صرف وہ احساسات ہیں جو ہمیشہ روح میں پیوست رہے ہیں اور یہ سب یکطرفہ نہیں رہا ہے۔ بڑے ابا سے لے کر ان کے صاحبزادگان تک ہمارے ساتھ نہایت شفقت اور محبت کا رشتہ قائم رہا جو ہمارے ان عم زادگان کی اولادوں میں بھی منتقل ہو گیا جن میں سے زیادہ تر ہمارے ہم عصر کچھ چھوٹے بڑے تھے۔ اس سلک گہر کے موتی ہر طرف بکھرے رہے لیکن ان کے درمیان جو ربط باہم تھا اس میں فرق نہیں آیا۔

اس پورے قبیلے میں زہد وتقویٰ، پابندیٔ شرع تو ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کا زہد خشک اور تنگ نظر نہ تھا اس میں بذلہ سنجی اس طرح آمیز تھی کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دین داری بھرپور تھی لیکن دنیا کو بھی خوب خوب برتا اس میں کمی نہیں آئی ''جام وسنداں باختن'' کا یہ فن نادر ونایاب تھا۔ ان تمام خواص کی سب میں موجودگی

کے باوجود مجھے وہ سب اپنی اپنی جگہ منفرد نظر آتے ہیں ان سب کا تذکرہ ایک ایک تصنیف کا طالب ہے جو طبعی کمزوریوں کی وجہ سے میرے لیے ناممکن ہے۔ کچھ عرصہ قبل چند تذکرے لکھ چکا ہوں جو میری تصنیف ''ہمارے گاؤں ہمارے لوگ'' میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک بڑے ابا کے سب سے بڑے بیٹے محمد عبداللہ فاروقی کے صاحبزادے شمس الہدیٰ فاروقی سے متعلق ہے جنھیں میں ہدیٰ بھائی کہتا تھا۔ حالانکہ رشتے میں وہ مجھ سے چھوٹے یعنی بھتیجے تھے اس مضمون کا عنوان ہے ''ہمارے ہدیٰ بھائی''۔ ایک مضمون مولوی فضل الرحمٰن صاحب سے متعلق ہے جنھیں میں فضلو بھائی کہتا تھا اور یہی اس مضمون کا عنوان ہے۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے تذکرے انگریزی میں لکھے، جو ہفتہ وار Radiance میں وقفہ وقفہ سے شائع ہوئے۔ ان مضامین کو انگریزی میں لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان بزرگوں کی صفات کا تذکرہ غیر اردو داں حلقے تک بھی پہنچے۔

ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ ان سب بھائیوں کی رنگت اور شباہت اتنی مشترک تھی کہ انہیں بلا بتائے پہچانا جاسکتا تھا۔ رنگت نہ گوری نہ گندمی بلکہ ایک ایسی صباحت ملیح کہ اس کے علاوہ کوئی اور لفظ مجھے نہیں ملتا۔ بس اسی صباحت کے ملتے جلتے شیڈ تھے لیکن ہر چہرے کی اس ہم رنگی کے ساتھ ساتھ اس پر ایک عجیب سی معصومیت جسے دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوسکتا تھا کہ اس میں دنیاداری کی پختگی بھی مضمر ہے۔ محبوب اس کی تازہ ترین مثال ہیں جو ابھی ابھی ہمارے سامنے سے گزر گئے ہیں۔ وہ حبیب الرحمٰن بھائی کے تین بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے ان کے چہرے کی بشاشت ہمیشہ مسکراہٹ لیے ہوئے سب نے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے والوں میں جو رعونت بالعموم ہوا کرتی ہے اس کی تو کوئی رمق بھی ان کے چہرے پر کبھی نمودار نہ ہوئی، نہ اس اللہ کے بندے کے چہرے سے اس کی علمیت کا رعب ظاہر ہوا لیکن یہاں بھی ایک حیرت انگیز امتزاج یعنی اس مرتبت اور علمیت کے عدم اظہار کے باوجود کسی طرح کی کسر نفسی نہیں تھی یعنی اپنی خودی مستحکم تھی جو اس فاروقی قبیلے کے تقریباً ہر فرد میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

ایک دلچسپ بات کا ذکر یہیں مناسب معلوم ہوتا ہے اس قبیلے کی جس رنگت اور ظاہری ہیئت و شباہت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ سب بڑی اماں کی ذات سے مستعار معلوم ہوتا ہے کیونکہ بڑے ابا کی رنگت اور جسمانی ساخت مختلف تھی اس کو بیان کرنا اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس پورے قبیلے میں جس کے افراد کی صحیح تعداد کا مجھے علم نہیں ہے صرف فضلو بھائی کے بیٹے محمد عزیر کی مکمل شباہت بڑے ابا کی تھی۔ عزیر میرے ہم عمر اور ایسے ہی تھے جسے لنگوٹیا یار کہتے ہیں لیکن مجھے اس شباہت کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ چند سال قبل عزیر کا ہندوستان آنا ہوا اور بہت مختصر سی ملاقات ہوئی اس وقت عزیر نے داڑھی رکھ لی تھی اسی وقت میں یہ دیکھ کر چونک پڑا کے بڑے ابا کو جس ضعیفی میں میں نے دیکھا تھی عزیر بالکل ہو بہو ویسا ہی تھا اور اس اعتبار سے وہ پورے قبیلے میں منفرد تھا۔

ذکر محبوب کے ساتھ اس گفتگو کو مختصر کرنا چاہتا ہوں۔ میں دسمبر ۱۹۷۵ء میں کلکتہ سے دہلی آیا، یہاں امریکن سینٹر میں بحیثیت اردو ایڈیٹر میرا تقرر ہو گیا تھا۔ اس وقت اوکھلا کے علاقے میں آبادی بہت کم تھی اور کرائے کے لیے

رہائشیں ناپید تھیں چنانچہ بڑی مشکل سے جامعہ اسٹاف کوارٹر کے سامنے ایک چھوٹا سا مکان مجھے مل سکا تھا۔ایک کمرہ ایک برامدہ ایک صحن اور ذرا ذرا سے ملحقات۔ غالباً ایک سال بعد آل انڈیا ریڈیو، گورکھپور سے دہلی کے لیے محبوب کا تبادلہ ہوا اور وہ بٹلہ ہاؤس میں کرائے کے ایک مکان میں رہنے لگے۔جلد ہی کسی دن انھوں نے اپنی بیوی ثریا سے کہا کہ چلو چچا چچی سے تمہاری ملاقات کرائیں چنانچہ ایک شام وہ اپنے چہرے پر فطری مسکراہٹ بکھیرے ہوئے ثریا کو لیے ہوئے چلے آئے۔ برآمدے میں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں، ایک پر میں اور دوسری پر ہماری اہلیہ۔محبوب میری چارپائی پر بیٹھ گئے اور ثریا خاتونِ خانہ کی چارپائی پر پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ذرا دیر بعد ثریا چونک پڑیں اور کہنے لگیں کہ چچا چچی کہاں ہیں، ان سے تو مل لیا جائے۔محبوب کی مسکراہٹ خندۂ دنداں نما کی حد تک پھیل گئی اور فرمایا کہ یہی تو چچا چچی ہیں۔ثریا کے ذہن میں دو بزرگوں کا تصور تھا ہم ابھی ان حدود میں نہیں داخل ہوئے تھے جہاں بزرگی بلا بتائے خود اپنی شناخت رکھتی ہے۔خیر اس کے بعد بے تکلفانہ آمد و رفت رہی پھر ہمیں بٹلہ ہاؤس کے قریب ذاکر نگر میں جو اس وقت واقعی ایک جنگل میں آباد مختصر سی بستی تھی ایک مکان مل گیا جو کافی کشادہ تھا اس کے گراؤنڈ فلور پر خود مالک مکان رہتے تھے اور بالائی منزل ہمیں کرائے پر دینے کے لیے بہ کراہت تیار ہو گئے۔اس مکان میں کھڑکی دروازے پلّوں سے گراں بار نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ رات کو ہم سیڑھی والے دروازے میں ایک چارپائی اڑسا دیا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد محبوب پھر گورکھپور بھیج دیے گئے لیکن کچھ عرصہ بعد ہی دہلی مراجعت کی اور ماہنامہ آجکل کی ادارت پر فائز ہوئے، اس وقت ان کی فیملی میں غزالی سلمہٗ کا اضافہ ہو چکا تھا جو آج محمود الرحمٰن فاروقی داستاں گو کی حیثیت سے عالمگیری کی مہم پر ہیں۔اسی اثنا میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب بھی کئی ریاستی مراکز میں اپنی فتوحات کا جھنڈا گاڑ کر دہلی وارد ہوئے۔ پھر تو ایک بڑا خوشگوار حلقہ سا بن گیا۔دیگر اقارب کی آمد و رفت بھی بڑھتی گئی اور وہ اس کارواں میں شریک بھی ہوتے گئے۔ وقت گزرتا گیا بقیہ ساری کہانی اپنے انجام تک بڑھتی ہوئی ہمارے سامنے ہے اسی سفر ناتمام میں کسی منزل پر محبوب ہم سے بچھڑ گئے اور ہم کو سوگوار چھوڑ گئے۔اللہ اپنی رحمتوں کے سائے میں ان کے مقامات بلند فرمائے۔

اس تمام اثناء میں محبوب صاحب وقتاً فوقتاً اپنی معصومانہ مسکراہٹوں کے ساتھ تشریف لاتے رہے کبھی ثریا کے ساتھ رکشے پر، کبھی کسی بیٹے کی بائک پر اور کبھی تنہا بھی رکشے پر۔ یہ ان کی والہانہ محبت اور تعلق خاص کی علامت تھی جسے انھوں نے اپنی پے در پے علالتوں کے درمیانی وقفوں میں جاری رکھا اور یہ میراث اپنے بیوی بچوں میں بھی چھوڑ گئے۔ایسا تو میں نے کسی اور عزیز اور دوست میں نہیں دیکھا۔

لیکن شاید یہ ان کے بزرگوں کی شفقتوں کا سلسلہ تھا جو پشت در پشت منتقل ہوتی رہیں۔ میں اس کا تذکرہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں تک بیان کروں طبیعت امڈی آتی ہے اور آنکھیں بھی پرنم ہو رہی ہیں۔ ہمارے بچپن میں بڑے ابا عید کے دن سویرے ہی آ کر زنجیر کھٹکھٹاتے اور ہمیں عیدی کے طور پر اکنی دے کر چلے جاتے پھر

جب ہم بڑی اماں کو سلام کرنے جاتے تو وہ دو پیسے عیدی دیتیں۔ یہ کتنی بڑی دولت تھی اس کو محسوس بھی نہیں کیا جا سکتا وہ شفقتیں ان کے بیٹوں میں منتقل ہوئیں، فصل زمانی اور فصل مکانی کی وجہ سے اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کا شدہ شدہ تذکرہ میری کتاب ''ہمارے گاؤں'' اور چند مضامین میں موجود ہے۔ وہ کتاب اور مضامین بھی ہماری مندرجہ بالا ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ ہمارے ابا جب بہت بیمار ہوئے بقول ان کے ان کی ۷۶ سال کی زندگی میں پہلی بار (اور آخری بار) بخار آیا تھا۔ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ بخار یا بیماری کسے کہتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن بھائی (شمس الرحمٰن کے والد) جو بڑے ابا کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے ابا کو دیکھنے آئے تو جھک جھک کر ان کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے اور اپنے منھ پر ملتے اور ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوئی جا رہی تھی۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے میں کلکتہ سے گھر آیا ہوا تھا۔ عزیر بھی موجود تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا لیکن اس کی اجازت تم ابا سے لو میں نہیں کہہ سکتا۔ عزیر فضلو بھائی کے بیٹے تھے لیکن ان کی شیر خواری کے زمانے میں ہی ان کی والدہ رحلت کر گئیں تو عبدالرحمٰن بھائی کی بیوی نے انھیں اپنی آغوش میں لیا وہ عبدالرحمٰن بھائی کو ہی ابا کہتے تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی چنانچہ عزیر کی پرورش واقعی ایک شہزادے کے طور پر ہوئی۔ خیر، میں نے ان کے کلکتہ جانے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ وہاں کسی کام کی تلاش کے دوران ٹائپ شارٹ ہینڈ وغیرہ سیکھنے لگے۔ ایم اے تو پہلے ہی کر چکے تھے لیکن مہینے دو مہینے بعد ایک دن عزیر میاں غائب ہو گئے۔ ہم لوگ بہت پریشان ہوئے لیکن مہینے بھر بعد مشرقی پاکستان سے خبریں آنے لگیں کہ ڈھاکہ میں دیکھے گئے، چٹاکانگ میں نظر آئے۔ خیر، ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔ کوئی چھ مہینے بعد ایک روز ہم لوگ دن کا کھانا کھا رہے تھے کہ عزیر صاحب اس طرح وارد ہوئے گویا وہ کہیں گئے ہی نہیں تھے اور کھانے میں شریک ہو گئے۔ اس کے بعد کی کہانی لمبی ہے اور دلچسپ بھی۔ مختصر یہ کہ ان کی شادی ہو گئی شمس الرحمٰن کی بہن سے۔

''جام و سنداں باختن'' کے جس فن کا میں نے ذکر کیا ہے اس کی محض چند مثالیں نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیے بغیر شاید یہ مضمون تشنہ رہ جائے اس لیے چند واقعات پیش کر رہا ہوں۔

طٰہٰ بھائی (حافظ محمد طٰہٰ) گورکھپور میں کورٹ انسپکٹر پولیس تھے، لیکن کسی مقدمہ کے سلسلے میں عدالت میں جانے سے پہلے متعلقہ داروغہ سے کہہ دیتے کہ مجھے ساری باتیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ ورنہ میں تمہارے مقدمے کی پیروی نہیں کروں گا۔ گورکھپور پولیس لائن میں مسجد تعمیر کروائی اور ریٹائرمنٹ تک وہاں تراویح خود پڑھاتے رہے۔ ڈاک خانے میں ایک اکاؤنٹ کھول رکھا تھا لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ اس میں سود کی رقم نہ شامل کی جائے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب گھر آ گئے تو ہمیشہ تلاوت کرتے ہوئے نظر آتے۔ ایک منشی جی (ریٹائرڈ پٹواری) ایک دن آئے اور اپنے بیٹے کو برا بھلا کہنے لگے کہ وہ پیسے نہیں دیتا۔ طٰہٰ بھائی چپ چاپ اندر گئے اور کچھ پیسے لا کر منشی جی کو دے دیے اور کہا کہ کسی سے نہ مانگا کرو۔ منشی جی کو بہت شرم آئی اور تاڑی پینا چھوڑ دیا کہ اسی کے لیے پیسے مانگتے تھے۔

فضلو بھائی (مولوی فضل الرحمٰن صاحب) نے کبھی بینک میں پیسہ نہیں رکھا اس میں سود کی رقم شامل ہو جاتی

تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں عربی کے استاد تھے۔ جہاں جہاں ان کا ٹرانسفر ہوا انھوں نے ایک مکان اور ایک مسجد ضرور بنائی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گھر آ کر بھی بڑے ابا کے دروازے کے سامنے ہی ہمارے ابا کی زمین کا ایک بڑا قطعہ تھا فضلو بھائی کی فرمائش پر انھوں نے کہا کہ جتنی ضرورت ہو زمین لے لو۔ فضلو بھائی نے وہیں مسجد تعمیر کروائی۔ ان کے بچپن کا ایک واقعہ ہے کہ داروغہ عبدالخالق نے جو رشتے میں چچا ہوتے تھے ایک بڑا سا بنگلہ تعمیر کروایا۔ افتتاح کی تقریب کے وقت رمضان کا زمانہ تھا لہٰذا انھوں نے اعلان کر دیا کہ اس روز سارے لوگوں کا افطار ان کے بنگلے میں ہوگا۔ لیکن افطار کے وقت انھوں نے دیکھا کہ فضلو بھائی مٹھی میں کچھ دبائے ہوئے گھر سے نکلے اور مسجد کی طرف بھاگ گئے۔ اگلے دن داروغہ صاحب نے بڑی اماں سے ان کی شکایت کی تو انھوں نے فضلو بھائی کو بلا کر پوچھا کہ ایسی نافرمانی کیوں کی تو رونے لگے اور کہا کہ سب لوگ وہاں افطار کرنے چلے گئے اور مسجد میں اذان کی فکر کسی کو نہیں تھی، اس لیے میں نے چھوہارے سے افطار کر کے اذان کہہ دی اور پھر ان کے پیسے کا کیا اعتبار اس افطار سے میں اپنا روزہ کیوں خراب کرتا؟

رجن بھائی (مولوی عزیز الرحمٰن صاحب) شبلی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں ۴۲ سال پڑھا کر ریٹائر ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ اس پوری ملازمت کے دوران میں نے ایک دن کی بھی اپنی ذاتی چھٹی نہیں لی اس لیے کہ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں ہوئی تو بلاوجہ چھٹی لے کر بچوں کا نقصان کیوں کرتا۔ کہنے لگے کہ سترہ سال تک میں ہر اتوار کو اماں سے ملنے کے لیے سائیکل سے اعظم گڑھ سے کوئریا پار آتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ۱۹۴۶ء میں دیوریا کے ڈسٹرکٹ سپلائی آفس میں ملازمت شروع کی۔ وہاں ہدیٰ بھائی نے میری ملازمت لگوائی تھی جب پہلے دن آفس جانے لگا تو انھوں نے کہا سنو اگر ایک پیسہ بھی لے کر کسی دن آئے تو گھر میں نہیں گھسنے دوں گا۔ وہ جنگ کے بعد کا زمانہ تھا ہر چیز کی قلت تھی حتیٰ کہ نمک، شکر، تیل تک نایاب تھا۔ کفن کے کپڑے کے لیے تحصیل یا کلکٹری سے پرمٹ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ ہر چیز ضلع سپلائی آفس کی معرفت ریگولیٹ ہوتی تھی، چنانچہ سپلائی آفس میں پیسہ برستا تھا لیکن ہدیٰ بھائی کو نہیں معلوم تھا کہ میں جب گھر سے چلا تھا تو ابا نے صرف ایک ہی نصیحت کی تھی کہ خبردار ناجائز ایک پیسے کو بھی ہاتھ نہ لگانا۔